

## مولانا محمد علی جوہر: برطانوی سامراج، سیاست، صحافت، شاعری اور آزادی ہند کے تناظر میں

**Maulana Muhammad Ali Jauhar: British Imperialism, Politics, Journalism, Poetry and in the context of Independance of India**

By Dr. Saqib Riaz, Associate Professor, Department of Mass Communication, Allama Iqbal Open University, Islamabad.

### ABSTRACT

The charismatic personality of Maulana Muhammad Ali Jauhar is well known all over the sub-continent. He was an eminent journalist, intellectual, orator and poet. He had a great command over both English and Urdu languages. To serve in the field of Politics and Journalism he left the government service. He brought out English and Urdu newspapers; "The Comrade" and "The Hamdard." Through his newspapers he raised strong voice against British imperialism and informed the common people of the imperialistic atrocities and the value of freedom. He also conveyed the same message in his sensational poetry. The aim of this article is to describe how he faced the British ruler in India and rallied the Indian Muslims for freedom.

**Keywords:** Muhammad Ali Jauhar, Journalist, Poet, Newspapers, *The Comrade*, *The Hamdard*.

”آزادی ہند“ کے لفظ میں محاکات نگاری کا پُر تاثیر تجسس عنصر موجود ہے۔ اس لفظ کو پڑھ یا سُن کر ذہن میں آزادی ہند کی تحریک کا سارا نقشہ آنکھوں کے سامنے ایک فلم کے سین کی مانند آ جاتا ہے۔ برصغیر میں

\* ایسوی ایٹ پروفیسر، شعبہ ابلاغ عامہ، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

انگریزوں کی آمد، مغل حکمرانی کا خاتمہ، انگریزوں کا تسلط، نوآبادیات نظام کا خاکہ، انگریزوں کا ظلم و بربریت، مسلم شناخت کے خاتمہ کی کوشش، مسلم تہذیب و تمدن سے نفرت، نہتے لوگوں کا قتل عام، عوام کو محکوم رکھنے کا فکری منصوبہ سب کی ہو بہو تصویر آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے۔

ہند کے رہنما اور عوام انگریزوں کی ساری چیرا دستیوں سے باخبر تھے۔ برصغیر کو انگریزوں کی ابدی محکومیت سے نجات کے لیے کسی جواز کی ضرورت تھی جو انگریز آفیسر کا مہاتما گاندھی کو ریل گاڑی میں سفر نہ کرنے دینے سے میسر آ گیا۔ مہاتما گاندھی کی سیٹ بک ہونے کے باوجود گاندھی کو جمع سامان گاڑی سے نکال باہر کیا۔ اس داستان کو مہاتما گاندھی اپنی کتاب ”تلاش حق“ میں بیان کرتے ہیں:

... نو بجے رات کو گاڑی نال کے دارالحکومت میرٹھ برگ پہنچی... اس کے بعد ایک (سفید چمڑے کا) مسافر آیا اور اس نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اسے معلوم ہو گیا کہ یہ کالا آدمی ہے۔ اس کی طبیعت منغض ہو گئی۔ وہ فوراً چلا گیا اور تھوڑی دیر میں دو ایک ریل کے ملازموں کو ساتھ لے کر آیا، انھوں نے تو کچھ نہیں کہا، مگر ایک اور افسر میرے پاس آ کر کہنے لگا، ”ادھر آؤ تمہیں گاڑی کے ڈبے میں بیٹھنا پڑے گا۔“ میں نے کہا، ”مگر میرے پاس تو اوّل درجے کا ٹکٹ ہے۔“ اس نے جواب دیا، ”اس سے کچھ نہیں ہوتا۔ میں جو تم سے کہتا ہوں کہ تمہیں گاڑی کے ڈبے میں چلنا پڑے گا۔“ ”اور میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ مجھے ڈربن میں اس ڈبے میں بیٹھنے کی اجازت دی گئی تھی اور میں اسی میں جاؤں گا۔“ ”ہرگز نہیں۔ تمہیں یہ ڈبہ خالی کرنا پڑے گا ورنہ میں پولیس کے سپاہی کو بلا کر تمہیں نکلوا دوں گا۔“ ”تمہیں اختیار ہے۔ میں اپنی مرضی سے تو جانے کا نہیں۔“ سپاہی آیا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے باہر کھینچ لیا۔ میرا سباب بھی اٹھا لیا گیا۔ میں نے دوسرے ڈبے میں جانے سے انکار کیا اور گاڑی چل دی۔<sup>(۱)</sup>

اس واقعے سے مہاتما گاندھی کی خودی کو جھٹیس پہنچی، اس کا مدد اوہندوستان کی آزادی کی صورت میں ہی ہو سکتا تھا اور یوں اس واقعے سے گاندھی نے آزادی کی شمع روشن کر دی۔ اونگھتے کو ٹھیلے کا بہانہ۔ اب ہندوستان کی دھرتی سے ایسے سپوت اٹھے جنھوں نے سیاسی سماجی اور فکری سطح پر آزادی کا نغمہ الاپنا شروع کیا۔ ان میں گاندھی (تلاش حق)، قائد اعظم محمد علی جناح، مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح (میرا بھائی)، پنڈت جواہر لال نہرو

(تلاشِ ہند)، سبھاش چندر بوس، لالہ لچپت رائے (جنھوں نے آزادی کی خاطر لاہور کے ریلوے اسٹیشن پر انگریز لالھیوں کی ضربوں کی زد میں جان دے دی)، سرسید احمد خاں (اسبابِ بغاوتِ ہند)، چودھری محمد علی، لیاقت علی خان، الطاف حسین حالی (مسدسِ حالی)، حسرت موہانی (شاعر، سیاست دان، صحافی)، علامہ اقبال (شاعرِ مفکر)، چودھری افضل حق (زندگی)، مولوی ڈپٹی نذیر احمد (ابن الوقت)، خدیجہ مسرور (آنگن)، سعادت حسن منٹو نے افسانوں میں سامراج کے بھیانک چہرے کو بے نقاب کیا اور متعدد سیاسی افسانے لکھے۔ ان مشاہیرِ ادب نے ہندوستان میں انگریز سامراج کے خلاف قلم کو تلوار کا روپ دیا۔ اس بنا پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اردو ادب نے تحریکِ آزادیِ ہند میں اہم کردار ادا کیا ہے جس کی اہمیت مستحکم ہے۔

ہند کی سرزمین پر جہاں ایک طرف ادب اپنا کردار ادا کر رہا تھا، وہاں غیر افسانوی ادب کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس لحاظ سے ۱۸۲۲ء میں منشی سدا سکھ کی ادارت میں کلکتہ سے شائع ہونے والے اخبار ”جامِ جہاں نما“ کو اولیت حاصل ہے۔ یہ اردو کا پہلا اخبار تھا۔ اردو زبان کی طرح اس اخبار کی زبان بھی تبدیل ہوتی رہی۔ پہلے اردو پھر فارسی ہوئی اس کے بعد پھر اردو ہو گئی۔ اس کے بعد جب اردو کو برصغیر کی قومی زبان کا درجہ ملا تو اردو اخبارات کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس کے بعد اردو کا مکمل اخبار ”دہلی اردو اخبار“ کا اجرا ہوا جس کے مدیر مولوی محمد باقر (مولانا محمد حسین آزاد کے والد) تھے۔ سرسید کے بھائی سید محمد نے ”سید الاخبار“ شائع کیا جس میں سرسید احمد نے اپنی صحافتی نگارشات کا آغاز کیا۔ اسی اخبار میں سرسید نے سیاسی سماجی ادبی معاشرتی اور اخلاقی موضوعات پر تواتر سے لکھا۔ سرسید کی انھی نگارشات کی بنا پر اردو زبان کو بھی علمی و ادبی زبان کا مقام عطا ہوا۔ اس کے علاوہ ”مظہر الحق“، ”صادق الاخبار“، ”گلِ رعنا“، پنجاب سے شائع ہونے والا ”کوہِ نور“، ”طلسمِ حیرت“، ”ریاض الاخبار“، ”سفیرِ آگرہ“، ”گلزارِ پنجاب“، ”مطلعِ نور“ اور ”چشمہ فیض“ قابلِ ذکر ہے۔ ۱۸۷۷ء میں سب اخباروں کا سر تاج ”اودھ پنچ“ کا اجرا ہوا جس کے مدیر منشی سجاد حسین تھے۔ اسی اخبار میں مشہور زمانہ ناول ”فسانہ آزاد“ قسط وار شائع ہوا جس کی ہیروئین اس بنا پر شادی کے لیے تیار ہوتی ہے کہ ہیرو پہلے ترکی فوج میں شامل ہو کر ترکی کے لیے جنگ میں اپنی خدمات پیش کرے۔

جو مشاہیرِ سیاسی، صحافتی، سماجی، معاشرتی، علمی اور ادبی فکر کی بنیاد پر انگریز سامراج سے ٹکرا رہے تھے، ان میں رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر کی شخصیت بھی انگریز سامراج کے لیے آتش فشاں پہاڑ ثابت ہوئی۔ مشہور انگریزی ناول ”نامِ مشین“ کے مصنف ایچ جی ویلز بھی مولانا محمد علی جوہر کی علمی ادبی اور انشا پردازی کے قائل تھے۔

نامور رہنما، شاعر، صحافی، مقرر اور انشا پرداز رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر ۲۶ نومبر ۱۸۷۸ء کو بھارتی

ریاست رام پور میں پیدا ہوئے۔ ابھی دو سال ہی کے تھے والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ پرورش کی ذمہ داری والدہ محترمہ کو نبھانا پڑی۔ اُردو اور فارسی کی تعلیم گھر پر ہوئی۔ اس کے بعد بریلی ہائی اسکول میں داخل کیے گئے۔ مزید تعلیم کے لیے علی گڑھ آ گئے۔ انگلستان جا کر ٹی سی ایس کی تیاری کی مگر ناکام ہوئے۔ والدہ کے کہنے پر واپس ہندوستان آئے۔ شادی کے بعد دوبارہ انگلستان کا رخ کیا اور آکسفورڈ سے بی اے کا امتحان پاس کیا۔ آکسفورڈ سوسائٹی کے پہلے ہندوستانی منتخب ہوئے۔ وطن واپس آئے اور ریاست رامپور میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہوئے۔ اس کے بعد بڑودہ ریاست میں اہم عہدے پر تعینات ہوئے۔ اس وقت انگریزی کے نامور اخباروں *The Time*, *The Manchester Guardian* اور *The Observer* میں کالم لکھے۔ آخر کار ۱۹۱۰ء میں ملازمت کو خیر باد کہہ کر ہمیشہ کے لیے صحافت اور سیاست کے میدان میں آ گئے۔ ان کی تصانیف، اخباری اور دیگر کارناموں کی فہرست کا خاکہ اس طرح مرتب کیا جاسکتا ہے۔

”کلام جوہر“: مجموعہ کلام ہے جس کو اُردو کے معروف شاعر عبدالماجد دریابادی نے مرتب کیا ہے۔ اس میں جوہر کا وہ کلام بھی شامل ہے جو انھوں نے اپنی اسیری کے دنوں میں کہا تھا۔

”کامریڈ“: انگریزی ہفت روزہ اخبار جس کا اجرا کلکتہ سے ہوا۔ دارالحکومت کلکتہ سے دہلی منتقل ہوا تو ”کامریڈ“ بھی دہلی سے شائع ہونے لگا۔ وائسرائے ہند اور جواہر لال نہرو بھی اس اخبار کا مطالعہ کرتے۔

”ہمدرد“: ۱۹۱۳ء میں ہمدرد اخبار کا اجرا کیا۔ اس اخبار کی کامیابی کے لیے ان کے دیرینہ دوست شاعر عبدالماجد دریابادی نے بھی بہت محنت کی لیکن مسلسل خسارے کی وجہ سے اخبار کو بند کرنا پڑا۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ: ۱۹۲۰ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد رکھی جس کو علی گڑھ کالج کی توسیع کہا جاسکتا ہے۔

”کلیات جوہر“: کلیات جوہر میں ان کا سارا کلام شامل ہے جس کو ایف سی کالج کے پروفیسر ڈاکٹر محمد علی خاں نے نہایت محنت سے مرتب کیا ہے۔

مولانا محمد علی جوہر لندن سے واپس آئے تو اپنی عملی زندگی کا آغاز رام پور ریاست میں تعلیم کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے کیا۔ مولانا محمد علی جوہر ہر لمحہ اپنی قوم کے لیے سوچتے تھے اپنی قوم کی فلاح کے لیے کوئی نہ کوئی منصوبہ اُن کے دل و دماغ پر حاوی رہتا۔ مولانا محمد علی جوہر جب شعبہ تعلیم کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے تو ان کی کوشش تھی کہ تعلیم کو ایسے خطوط پر استوار ہونا چاہے جو ہندوستان کی عوام میں پختہ شعور کو اجاگر کرنے کا سبب بنے۔ اس لحاظ سے مولانا محمد علی جوہر ہندوستان میں آزادی کی تحریک کی راہ کو پہلے ہی ہموار کر رہے تھے۔ کیوں کہ جو انقلاب تعلیم کے ذریعے لایا جاسکتا ہے، ایسا انقلاب ہی جاودا ہو سکتا ہے۔ مولانا محمد علی جوہر کے اس موقف میں ذرا سی

تبدیلی بھی نہ آئی:

زمانہ نام ہے میرا تو میں اُن کو دکھا دوں گا  
کہ جو تعلیم سے بھاگے گا نام اُس کا مٹا دوں گا  
مولانا محمد علی جوہر کی سیاسی تربیت میں اولیت علی گڑھ کالج کو حاصل ہے۔ جس وقت مولانا محمد علی جوہر تعلیم حاصل کر رہے تھے اُس وقت ہندوستان کا ماحول سیاسی، سماجی، مذہبی اور علمی لحاظ سے بہت ہی گنجلک تھا۔ کیوں کہ اس وقت ایک طرف تو عیسائی مشنریاں تھیں جو اپنے مذہب کی اشاعت و ترویج کے لیے کوشاں تھیں اور جن کی شاخیں ہندوستان کے دور دراز تک پھیلی ہوئی تھیں۔ عیسائی مشنریاں سادہ لوح ہندوستانیوں کو مختلف نوع کے لالچ دے کر مذہب عیسائیت اپنانے میں برسرِ پیکار تھیں۔ مسیحی مذہب کی ترویج کے لیے سب سے بڑا لالچ اعلیٰ عہدے کا ہوتا تھا۔ بقول اکبر الہ آبادی:

بچ بنا کر اچھے اچھوں کا لبھا لیتے ہیں دل

ہیں نہایت خوشنما دو جیم ان کے ہاتھ میں

اس کے برعکس دوسری طرف ہندو بھی انگریز سامراج کے اس بھیانک منصوبہ کو خاک میں ملانے کے لیے میدانِ عمل میں آگئے۔ جس کی بدولت ہندوؤں میں بھی بہت سی تحریک وجود میں آ گئیں۔ ان میں راجا رام موہن رائے کی برہموسماج، مہاراشٹر میں جسٹس مہادیو گووند رانا ڈے کی ارتھنا سماج، سوامی دیانند سرسوتی کی آریہ سماج اور سوامی ودیکا نندی رام کرشن مشن قابل ذکر ہیں۔

اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کی حالت بہت زیادہ تشویش ناک تھی، تعلیم کا تو سرے سے کوئی بندوبست نہ تھا، انگریز سامراج نے مسلمانوں پر سارے تعلیمی دروازے بند کیے ہوئے تھے۔ اس وقت جتنے بھی اخبار شائع ہو رہے تھے سب کے ایڈیٹر ہندو تھے ان میں سے صرف ایک اخبار کا ایڈیٹر مسلمان تھا۔ اس وجہ سے مسلمانوں کی جہالت، کم علمی، اوہام پرستی، دقیانوسی تصورات اور جہالت پر مبنی رسم و رواج اپنے عروج پر تھے۔ ایسے وقت میں سرسید احمد خاں ایک مسیحی کے روپ میں نمودار ہوئے۔

سرسید کی علی گڑھ تحریک نے ہندوستان کے مسلمانوں کی سیاسی، سماجی، علمی اور صحافتی تربیت کے لیے مولانا محمد علی جوہر جیسی شخصیات کو متاثر کیا۔ اس وجہ سے مولانا محمد علی جوہر عالمی سیاست اور ترقی پسند خیالات سے واقف ہوئے۔ مولانا محمد علی جوہر جب ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت کا دوسری اقوام سے موازنہ کرتے تو ظاہر ہوتا کہ ہندوستان کے مسلمان اپنے نصب العین سے کتنے دور اور کم علم ہیں، ایسے میں آزادی کی شمع کیونکر روشن ہو سکتی

ہے۔ مولانا محمد علی نے ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت زار کا جائزہ لیا تو مسلمانوں کو پس ماندہ اور کم علمی میں پایا۔ مسلمان ہر بات کو انگریزوں کی چال سمجھتے، ہر نئے علم کو مذہب دشمنی پر لاگو کرتے، تمام جدید علوم سے ان کو نفرت تھی، انگریزی زبان کو پڑھنا اور بولنا گناہ سمجھتے۔ اس لیے عوام کی تربیت کوئی آسان کام نہ تھا لیکن مولانا محمد علی جو ہر کی جو تربیت علی گڑھ اور سرسید احمد خاں کے زیر اثر ہوئی، وہی اس درد کی دوا بنی۔ اس کا اعتراف خود مولانا محمد علی جوہر اپنے شعر میں کرتے ہیں:

سکھایا تھا تمھی نے قوم کو یہ شور و شر سارا

جو اس کی انتہا ہم ہیں تو اس کی ابتدا تم ہو !!

۱۹۰۵ء میں انگریز سامراج نے ایک نئی چال کو ترتیب دیا جو تقسیم بنگال کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس شر انگیزی کا بانی لارڈ کرزن تھا۔ اس تقسیم سے وقتی طور پر تو مسلمان خوش ہو گئے تھے۔ لیکن ہندوؤں میں اس سے تشویش پیدا ہو گئی۔ اس موقع پر ہندو رہنما گوپال کرشن گوکھلے ابھر کر سامنے آئے اور ایسے وقت میں روس کی شکست کی خبریں عام ہوئیں تو اس سے ہندو عوام کو بڑی تقویت ملی اور یوں تقسیم بنگال کے خلاف تمام ہندوستان میں شدت سے مظاہرے شروع ہو گئے۔ آخر کار ۱۹۱۱ء میں لارڈ ہارڈنگ ہندوستان آئے جس کے دھیمے مزاج نے ہندوستان کے حالات کو بہتر کیا اور آخر کار انھیں کو ہندوؤں کے مطالبات کو تسلیم کرنا پڑا اور یوں تقسیم بنگال کو منسوخ کر دیا گیا۔ اس پر انگریز سامراج کو مسلم لیگ کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس پر مولانا محمد علی جوہر نے جو دلچسپ تبصرہ کیا اس کے بارے میں رئیس احمد جعفری اپنی کتاب مطابقت محمد علی میں لکھتی ہیں:

حقیقتاً پہلی تقسیم بنگال (Vivisection) سے مشابہ تھی، جو یورپ کے ڈاکٹر

جیتے جاگتے حیوانوں کو زخم لگا کر، ان کی تکلیف کا مشاہدہ کرنے کی غرض سے عمل

میں لایا کرتے ہیں۔<sup>(۲)</sup>

مولانا محمد علی جوہر کے ان کلمات کا بنگال کی عوام کو سننا تھا کہ فوراً سارا بنگال درد سے چیخ اٹھا، ”مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا۔“

۱۹۱۱ء میں مولانا محمد علی جوہر نے اپنی صحافت کا آغاز کلکتہ سے انگریزی اخبار ”کامریڈ“ کے اجرا سے کیا۔ ”کامریڈ“ اخبار نے ہند کے مسلمانوں کی سیاسی بیداری میں اہم کردار ادا کیا۔ مسلمانوں میں اپنی مسلم خودی، تہذیب و تمدن، اصلاح، قومیت کا احساس، مذہب کا تحفظ، ملی جذبہ اور ہندوستان میں مسلم تشخص کے احیا کا احساس ”کامریڈ“ نے ہی اجاگر کیا۔ ۱۹۱۴ء میں جب برطانیہ اور آسٹریا نے مل کر پوری دنیا کو جنگ کی بربریت

میں دھکیل دیا تو ترکی کو جرمنی کا ساتھ دینا پڑا۔ برطانیہ میں انگریزی اخبار مسلسل ترکی کی مخالفت میں لکھ رہے تھے۔ ایسے میں صحافتی سطح پر کامریڈ انگریزی اخبارات کو مؤثر اور پُر تاثیر تجسس سے بھرپور جواب دے رہا تھا۔ ایسے میں کامریڈ میں لکھا گیا مضمون *Choice of Turks* ترکوں کے احساسات اور جذبات کی ترجمانی کا مظہر ثابت ہوا۔ ”کامریڈ“ کا جو انگریزی اُسلوب تھا، اُس کی قدردانی کا احساس خود انگریز حکام کو بھی تھا۔

اس وقت کچھ اخبار تو انگریز سامراج کی تعریف و توصیف میں قلم چلا رہے تھے۔ لیکن ”کامریڈ“ ہندوستان کی باقی قوموں کے ساتھ ہندوستان سے باہر کی اقوام کو بھی ملتِ اسلامیہ کے افکار اور مسلم تشخص سے آگاہ کر رہا تھا۔ ابھی ”کامریڈ“ کا پہلا شمارہ ہی شائع ہوا تھا کہ ترکی جنگِ طرابلس سے نکل کر جنگِ بلقان میں پھنس گیا۔ ان حالات میں مولانا محمد علی جوہر کے قلم میں بھی مزید زور پیدا ہو گیا جس کی تاب انگریز سامراج نہ لاسکا اور ”کامریڈ“ کی توانا زبان کے سبب انگریز حکام نے ”کامریڈ“ کو بند کر دیا اور مولانا محمد علی جوہر کو پابندِ سلاسل کر دیا گیا۔ کامریڈ کے سنجیدہ مضامین اور زبان دانی کی دھاک دوسرے انگریزی اخبارات پر واضح تھی جس میں ہندوستان کے مسلم تشخص کا مقدمہ بڑی عمدگی سے لڑا جا رہا تھا اور جس کو پڑھنے والوں کی تعداد ہندوستان سے باہر بھی تھی۔

مولانا محمد علی جوہر کا دوسرا اخبار ”ہمدرد“ تھا۔ مولانا محمد علی جوہر جب علاج کی غرض سے لندن گئے تو ”ہمدرد“ کو بند کرنا چاہتے تھے۔ لیکن ایسے وقت میں ان کے اردو کے معروف شاعر دوست عبدالماجد دریابادی نے اخبار کی ذمہ داری کی حامی بھر لی۔ یہ ایک مشکل امر تھا۔ ”ہمدرد“ کے شائع ہوتے وقت جنگِ بلقان ختم ہو چکی تھی۔ اس لیے ”ہمدرد“ میں اب وہ پہلے والی سی بات نہ رہی۔ اخبار مسلسل خسارے میں جا رہا تھا۔ اس کی دو وجوہات تھیں ایک تو یہ کہ جنگ کے ختم ہونے کی وجہ سے لوگوں میں دلچسپی کا عنصر ختم ہو گیا تھا اور دوسرا یہ کہ ”ہمدرد“ میں اشتہارات شائع نہیں ہوتے تھے۔ آخر کار مولانا محمد علی جوہر کو ”ہمدرد“ بند کرنا پڑا۔ ”ہمدرد“ کی خصوصیات کو ان الفاظ میں بیان کیا جاسکتا ہے:

۱۔ ”ہمدرد“ کا اُسلوب بہت شگفتہ اور ادبی شان سے مزین تھا۔

۲۔ اشتہارات کا شائع کرنا سختی سے منع تھا۔

۳۔ ”ہمدرد“ میں زیادہ سے زیادہ ملکی اور عالمی خبریں شائع ہوتیں اور ”ہمدرد“ کا مقصد بھی یہی تھا۔

۴۔ خبر واقعات کی پوری جانچ کے بعد ہی ”ہمدرد“ کی زینت بنتی۔

۵۔ ”ہمدرد“ کا مقصد لوگوں میں زیادہ سے زیادہ سیاسی آگاہی اور شعور کو بیدار کرنا تھا۔

۶۔ صرف غلط اصولوں، واقعات اور حکام کی پالیسیوں کی مخالفت کی جاتی تھی۔

۷۔ اخبار کو سیاسی مقصد کے علاوہ کسی اور مقصد کے لیے استعمال نہیں کیا۔

۸۔ کبھی کسی کی ذاتیات کو نشانہ نہیں بنایا۔

۹۔ اخبار زیادہ عرصہ تک شائع نہ ہو سکا۔

تحریک آزادی میں ”کامریڈ“ اور ”ہمدرد“ نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ انہی اخباروں کے توسط سے عوام میں آزادی کا شعور بیدار ہوا۔ اس اخبار کی پالیسی پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر سمیع احمد اپنی کتاب اُردو صحافت اور تحریک آزادی میں لکھتے ہیں:

اس اخبار کی پالیسی اور طرز نگارش اور اخباروں سے بالکل مختلف تھی۔ اس میں نہ سنسنی خیز سرخیاں ہوتی تھیں اور نہ نوجوانوں کے جذبات کو براہیختہ کرنے والی خبریں۔ مولانا محمد علی کا حکم تھا کہ اخبار میں صرف معلومات دی جائیں۔ ایڈیٹوریل کے لوگ اس حکم کی تعمیل کرتے تھے۔ اخبار فکار و نظریات کی تبلیغ و اشاعت کے لیے نکالا گیا تھا، تجارت کی خاطر نہیں...<sup>(۳)</sup>

اس وقت ہندوستان مسلم اُمہ کے مسائل کا گنجینہ تھا۔ انگریزوں کے دلوں میں اب مولانا محمد علی جوہر کے لیے سوا نفرت کے اور کچھ نہ تھا۔ انگریز سامراج کے خلاف سخت زبان کی وجہ سے پابندی عائد کردی، ہمدرد خسارے میں جا رہا تھا، گھر پر بیٹی آمنہ صاحبہ فراش تھی اور خود مولانا محمد علی جوہر جیل کی سلاخوں کے پیچھے تھے۔ ایسے وقت میں کون ہے جو اپنے اصولوں کو ترک نہ کر دے، کون سامراج کے آگے نہ جھکتا، کون اپنے اصولوں کی پاسداری کرتا۔ لیکن مولانا محمد علی جوہر کے جذبہ حریت میں کہیں بھی لغزش نہیں آئی۔

مولانا محمد علی جوہر کو جو حالات درپیش تھے ان کے ذکر سے ہی دل گھبرا جاتا ہے۔ اس معنویت میں مولانا محمد علی جوہر واقعی ایک سچے مجاہد تھے جن کا اپنا کوئی ذاتی مفاد درپیش نہ تھا۔ ان سب مسائل کا سامنا اللہ کی قوم کی رہنمائی کے لیے کر رہے تھے، ورنہ مولانا محمد علی جوہر کو اس وقت کے غلام ہندوستان میں بھی اچھے سے اچھا عہدہ مل سکتا تھا، ایک شاہانہ زندگی بسر کر سکتے تھے اور غلام ہندوستان کے جہنم نما ماحول کو چھوڑ کر یورپ کے رنگین ماحول میں زندگی بسر کر سکتے تھے۔ لیکن ان کو بس اپنی قوم کی تقدیر بنانے کی فکر تھی جس کے لیے ایک حریت فکر کا ہونا ضروری تھا تا کہ پہاڑ جیسے مسائل کا پامردی سے مقابلہ کیا جاسکے۔ اس وقت کے مسائل کا ذکر رئیس احمد جعفری ان الفاظ میں کرتے ہیں:

ملت کو سمجھانے والا ایک تھا، بہکانے والے بہت تھے، صراطِ مستقیم کی دعوت دینے والا تنہا تھا اور مشرق کی طرف منہ کر کے مغرب کا عزم سفر کرنے والوں کی رہنمائی کو انبؤہ کا انبؤہ موجود تھا، یہ وجہ تھی کہ محمد علی کو مختلف روپ بھرنے پڑے، کبھی وہ مطرب بنا کبھی ندیم، کبھی حکیم بنا کبھی مصلح، کبھی خطیب بنا کبھی انشا پرداز، کبھی مدبر بنا کبھی مفکر، کبھی واعظ کبھی ناصح، کبھی دوست بنا کبھی دشمن۔ وہ نہ کسی کا دوست تھا نہ دشمن، نہ ناصح تھا نہ واعظ، نہ مفکر نہ مدبر، نہ انشا پرداز نہ خطیب، نہ مصلح نہ حکیم، نہ ندیم نہ مطرب، وہ قوم کا چاکر تھا اور قوم کے لیے وہ سب کچھ بن سکتا تھا، سب کچھ بنا۔<sup>(۴)</sup>

رئیس احمد جعفری نے جن مسائل کا ذکر کیا ہے ان میں کسی بھی صاحب بصیرت انسان کو انکار نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ ایک تو ان کی تربیت سرسید کے زیر اثر ہوئی دوسرا وہاں علامہ شبلی نعمانی جیسے عالم اسلام کے داعی کے زیر اثر مذہب عشق کا درس بھی ملا تو یہ سب مسائل ان کے سامنے معمولی نوعیت کے تھے۔ ان کی فکر حریت میں ذرا سا بھی ابہام پیدا نہ ہو سکا۔ مولانا محمد علی جوہر کی زندگی علامہ اقبال کی اس معنویت کی آئینہ دار تھی:

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی  
کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی

یہ غازی یہ تیرے پُر اسرار بندے جنہیں تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی  
دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی  
مولانا محمد علی جوہر کے اخبارات نے جن اہم موضوعات کو بیان کیا ان میں سے اکثر بہت ہی اہم کے نوعیت تھے۔ یہ صرف موضوعات ہی نہ تھے بلکہ اس وقت کے غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف اور اپنے ہی دوستوں کی انگریز وری کے خلاف اعلانِ جنگ تھا۔ اس لحاظ سے پہلا معرکہ تو سعودی تنازعے سے تعلق رکھتا ہے جس میں مشائخ و صوفیا کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا۔ اس کے علاوہ مولانا ظفر علی خان کا معاملہ بھی سنگین تھا جن کے اخبار میں اشتہارات کو بھی جگہ دی جاتی تھی اور یہ بات مولانا محمد علی جوہر کو کیوں کر پسند آ سکتی تھی۔ ان کی تنقید کا تیسرا حدف خواجہ حسن نظامی کی شخصیت تھی۔

مولانا محمد علی جوہر شاعر، سیاست دان، انشا پرداز، مقرر اور مجاہد ہونے کے ساتھ ساتھ ایک دانش ور بھی

تھے۔ ایسے نازک اور آزمائش کی گھڑی میں ایک دانش ور کا کردار بہت اہم ہوتا ہے۔ یہ ماحول چاہے سیاہ فام لوگوں کا ہو یا ہندوستان کا، ایسے ہی ماحول میں دانش ور سماج میں تبدیلی کے لیے آواز بلند کرتا ہے۔ دانشور میں کیوں کہ عام آدمی سے زیادہ سمجھ بوجھ ہوتی ہے، وہ ملک میں موجود غیر ملکی استبداد کے خلاف عوام کو شعور اور آگاہی فراہم کرتا ہے جس کی بنا پر عوام میں اُن کا بڑا حلقہ بن جاتا ہے۔ مولانا محمد علی کا حلقہ تو پورا ہندوستان تھا۔ دوسرے ادیبوں کی طرح مولانا محمد علی نے کبھی بھی انگریز سامراج سے اپنے مفاد کی بات نہ کی اُن کا نصب العین صرف اپنی قوم کی آزادی تھا۔

۱۹۱۹ء میں جب برطانیہ نے جنگ عظیم میں آسٹریا اور جرمنی کو شکست فاش دی تو اس کے بعد برطانیہ مسلمانوں سے کیے گئے وعدے سے بھی پھر گیا جس میں کہا گیا تھا کہ سلطنت عثمانیہ کو برقرار رکھا جائے گا۔ اس سے ہندوستان کے تمام مسلمانوں میں ایک تشویش کی لہر دوڑ گئی کہ اب سلطنت عثمانیہ کا کیا ہوگا۔ کیوں کہ اس وقت سلطنت عثمانیہ تمام مسلم دنیا کا فخر سمجھا جاتا تھا۔ سلطنت عثمانیہ کا ادارہ مسلم دنیا کی نظر میں خانہ کعبہ کے بعد دوسری اہم مذہبی جگہ تھی۔ اس کے سربراہ کو خلیفہ کہا جاتا تھا جس کو ہر جگہ عزت و احترام حاصل تھا۔ اس بنا پر خلافت عثمانیہ کا دفاع کرنے اور وہاں موجود مقدس مقامات کی حفاظت کے لیے تحریک خلافت وجود میں آئی۔ اس تحریک کے سربراہ علی برادران، مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی جوہر تھے۔ اس تحریک میں مولانا ابوالکلام آزاد، حسرت موہانی اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری جیسے علمائے کرام بھی پیش پیش تھے۔

یہ تحریک بہت جلد ہندوستان کے کونے کونے میں پھیل گئی۔ لوگ جوق در جوق اس میں شامل ہونے لگے۔ اس سے متعلقہ ہر جلوس میں شرکت کو مذہبی فرض سمجھا جانے لگا۔ عوام نے پانی کی طرح روپیہ صرف کیا نقدی، سونا، زیور جس کے پاس جو کچھ تھا سب جمع کر دیا۔ مسلم عوام کا جذبہ دیدنی تھا۔ اس تحریک کے چند بڑے مقاصد تھے:

۱۔ خلافت کا ادارہ جو مقدس تھا کو ختم نہ کیا جائے اس کو اپنی اصلی حالت میں ہی برقرار رہنا چاہیے۔

۲۔ حجاز مقدس میں غیر مسلم فوج داخل نہیں ہوگی۔

۳۔ ترکی علاقے خلیفہ کے ہی کنٹرول میں رہیں گے۔

ابھی تحریک خلافت نے زور پکڑا ہی تھا کہ اچانک مہاتما گاندھی نے بھی اپنی شمولیت کا اعلان کر دیا۔ اس اعلان کے ہوتے ہی ہندو بھی جوق در جوق اس تحریک میں شامل ہونے لگے۔ اب ہندو مسلم انگریزوں کے خلاف ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے۔ اس کے لیے ہند کے عوام نے اپنی جان کی بازی لگا دی۔ مولانا محمد علی جوہر پکاراٹھتے ہیں:

دے نقد جاں تو بادۂ کوثر ابھی ملے

ساقی کو کیا پڑی ہے کہ یہ مے ادھار دے

تحریکِ خلافت کے ساتھ ساتھ تحریکِ ترکِ موالات، سول نافرمانی اور سب سے بڑھ کر تحریکِ عدم تعاون بھی شروع ہو گئیں۔ ہندو مسلم اتحاد کی اس سے بڑھ کو کوئی اور مثال تلاش کرنا مشکل ہے۔ گاندھی نے برملا عدم تعاون کا اعلان کیا جس کے اہم نکات یہ تھے:

۱۔ تمام ہندو مسلم رہنما انگریزی اعزازات حکومت کو واپس کر دیں۔

۲۔ تعلیمی اداروں کا مکمل بائیکاٹ کیا جائے۔

۳۔ تمام سرکاری اداروں مثلاً عدالت وغیرہ کا بائیکاٹ کیا جائے۔

۴۔ انگریزی مال خریدنے کی بجائے اپنے دیسی مال کا استعمال کیا جائے۔

اب مولانا محمد علی جوہر نے ایک وفد تشکیل دیا جس کا کام لندن جا کر برطانوی وزیراعظم لائیڈ جارج سے مذاکرات کرنا تھا۔ اس وفد کی قیادت خود مولانا محمد علی جوہر کر رہے تھے۔ لیکن بد قسمتی سے مذاکرات ناکام ہو گئے۔ برطانوی وزیراعظم نے دو ٹوک الفاظ میں کہہ دیا کہ جو سلوک جرمنی سے ہو گا وہی ترکی کے ساتھ روا رکھا جائے گا۔ وطن واپس آ کر مولانا محمد علی جوہر نے پھر سے اپنا صحافتی قلم سنبھال لیا اور ”ہمدرد“ میں عوام کو انگریز حکام کی منافقانہ پالیسیوں سے آگاہ کیا۔ ”ہمدرد“ کے علاوہ مولانا ظفر علی خان کا ”زمیندار“ بھی اپنا کردار بخوبی نبھاتا تھا۔ ابھی معاملات ٹھیک سے طے بھی نہیں پائے تھے کہ ضلع گورکھ پور میں چوری چورہ گاؤں میں عوام اور پولیس میں اچانک تصادم کی خبریں ہندوستان کے طول و عرض میں پھیل گئیں جس میں پولیس نے عوام پر فائر کھول دیے تھے، عوام نے مشتعل ہو کر تھانے کو آگ کے شعلوں کی نذر کر دیا جس میں بہت سے سپاہی جاں بحق ہو گئے۔ اس سانحہ کا گاندھی جی پر برا اثر پڑا جس کی بنا پر گاندھی نے تحریکِ خلافت سے دستبردار ہونے کا اعلان کر دیا۔ اور یوں تحریکِ خلافت کمزور پڑ گئی۔ مولانا محمد علی جوہر کی انتھک محنت کے ذکر میں نہیں احمد جعفری لکھتے ہیں:

محمد علی کی ساری زندگی میدانِ جہاد میں گزری، جہاد صرف کافروں اور مشرکوں سے

نہیں، بے دینوں اور ملحدوں سے نہیں، ملت کے دشمنوں اور قوم کے غداروں سے

نہیں بلکہ دوستوں اور ساتھیوں سے بھی، نیاز مندوں اور جاں نثاروں سے بھی،

مداحوں اور خیر خواہوں سے بھی، عزیزوں اور عزیز ترین دوستوں سے بھی،

رفیقانِ راہ اور شرکا، منزل سے بھی۔ یہ اسی کا کلیجہ تھا کہ جب تک زندہ رہا،

میدانِ جنگ میں ڈٹا رہا۔ ان معرکوں سے اگر نیپولین کو سابقہ پڑا ہوتا تو اس کا دل پھٹ جاتا، ان حالات میں اگر برک کو بولنا پڑتا تو اس کی زبان گنگ ہو جاتی، اس ماحول میں اگر میکا لے کو انشا پر دازی کے جوہر دکھانا پڑتے تو وہ قلم پھینک دیتا۔<sup>(۵)</sup>

ابھی تحریکِ خلافت میں دم باقی تھا کہ حکومتِ برطانیہ نے چیمس فورڈ اصلاحات کی منظوری دے دی۔ اس کے ساتھ ہی بدنام زمانہ قانون رولٹ ایکٹ بھی پاس کر دیا جس کے مطابق کسی بھی شخص کو بغیر کسی وجہ کے گرفتار کیا جاسکتا تھا۔ اس کا مقصد صرف اور صرف ہند کے رہنماؤں کے دلوں میں حکومت کا خوف پیدا کرنا تھا۔ لیکن برطانوی حکومت کا یہ ظالمانہ قانون مولانا محمد علی جوہر کے ارادوں کے سامنے ہچ ثابت ہوا۔ اس کی مخالفت پورے ہندوستان میں کی گئی اور پھر سے ایک بار ہندوستان میں جلسے اور ملک گیر تحریک شروع ہو گئی۔ اس بار برطانیہ کے حکام نے اس تحریک کو تشدد سے دبانا چاہا۔ جس کا نتیجہ جلیاں والا باغ کی صورت میں نکلا۔ جزل ڈائر نے ۱۹۱۹ء میں نہتے عوام پر بربریت کا مظاہرہ کرتے ہوئے گولیوں کی بارش کر دی۔ امرتسر کی سرزمین کو تازہ سرخ خون میں نہلا دیا۔ نہتے عوام سینوں پر گولیاں کھاتے ہوئے ایک دوسرے کے اوپر نیچے، دائیں بائیں گرنے لگے۔ جزل ڈائر نے تقریباً پندرہ سولہ راؤنڈ نہتے اور غریب عوام پر خالی کر دیے۔

ترک موالات کی مخالفت جب سرسید احمد خاں کے رفقاء نے کی تو اس پر بھی مولانا محمد علی جوہر نے اپنی ناراضگی کا اظہار کیا۔ لیکن سرسید احمد خاں نے ایسے وقت میں اپنے رفقاء کی بات ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ کیوں کہ سرسید احمد خاں اور مولانا محمد علی جوہر میں ایک قدر مشترک تھی کہ دونوں اپنی قوم کی تقدیر بدلنے کا منصوبہ لندن سے ہی لے کر آئے۔ تو یہ کیونکر ہو سکتا تھا کہ سرسید احمد خاں اپنے رفقاء کی بات مانتے۔ لیکن مولانا محمد علی جوہر مستقبل میں آنے والے خطرے کو بھانپ گئے تھے جس کی بناء پر مولانا محمد علی جوہر نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد رکھی جس کا مقصد اسلامی تشخص اور فکر کا تحفظ کرنا تھا۔

۱۹۲۹ء کو جب پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی بدنام زمانہ نہرو رپورٹ پیش کی تو ہندو ذہنیت آشکار ہو گئی۔ کنائے کے انداز میں ایک گہری سازش پنہا تھی۔ یہ مستقبل میں ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے 'موت کا پھندا' کا استعارہ تھا جس کو مولانا محمد علی کی فہم و فراست نے فوراً بھانپ لیا۔ اسی بناء پر مولانا محمد علی جوہر نے کانگریس کو خیر باد کہا اور مسلم لیگ میں آ شامل ہوئے۔ لیکن نہرو کی دانستہ کارستانیوں یہیں تک محدود نہ تھیں۔ اب ان کے ساتھ ابوالکلام آزاد بھی شامل ہو گئے اور دونوں نے مل کر ایک اور نئی اُریب کی چال "نیشنل یونین" قائم کی۔ اس میں صرف اُسی شخص کو داخلے کی اجازت تھی جو کسی فرقہ دارانہ جماعت سے تعلق نہ رکھتا ہو۔ یہ وہی بات تھی جس کا اظہار کبھی

انگریز حکام نے بھی کیا تھا کہ ”یہاں ہندوستانیوں اور کتوں کا داخلہ منع ہے۔“ زمانے کی تبدیلی کے ساتھ جملے بھی تبدیل ہو گئے۔ لیکن ابوالکلام آزاد اور نہرو کا منصوبہ انگریزوں کے منصوبہ سے زیادہ خطرناک تھا۔ یعنی چاہے خس پوٹ۔ ہند کے مسلمانوں کے لیے یہ ایک جہنم کے مترادف تھا جس کا نقشہ دانتے اور ملٹن کے شہرہ آفاق ادب میں بھی ملتا ہے۔ یہاں بھی جہنم میں داخلے کی شرط موجود ہے ”یعنی امید کو باہر چھوڑ کر آؤ۔“ امید کو باہر چھوڑ کر آؤ، یہاں ہندوستانیوں اور کتوں کا داخلہ منع ہے، اس کے بعد نیشنل یونین میں داخلے کی شرط۔ تینوں جملوں کی بنیاد ایک ہی تصور پر مشتمل ہے۔ مولانا محمد علی جوہر ان سب عزائم سے آگاہ تھے۔ اس حوالے سے پروفیسر خلیق احمد نظامی اپنے مضمون ”ہندوستان کی سیاسی بیداری میں مولانا محمد علی جوہر کا حصہ“ میں لکھتے ہیں:

مولانا محمد علی جوہر نے ۱۹۰۸ء کے نیوز پیپر ایکٹ، ۱۹۰۹ء کی منٹو مورلے ریفارم، ۱۹۱۵ء کے ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ، ۱۹۱۶ء کے سیڈلز کمیشن پھر ۱۹۱۹ء کے مانٹنگو چیفسورڈ ریفارم، پھر ۱۹۲۷ء میں سائنس کمیشن کے تقرر میں سامراجی روح کو کارفرما دیکھا تھا۔ اس سامراجی ذہن میں ”لڑاؤ اور حکومت کرو“ کے خطرناک نظریے پر اپنی ساری کوشش کی بنیاد رکھی تھی۔ تقسیم بنگال اور اس کی تنسیخ میں یہی مقاصد کارفرما تھے، مولانا محمد علی جوہر نے تمام دستوری اصلاحات اور سیاسی کاوشوں کی سمت کو سمجھ لیا تھا۔<sup>(۶)</sup>

شاعری کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ عرب معاشرے میں تو شاعری سے ایسے ایسے کام لیے ہیں کہ جن کو پڑھ کر حیرانی کا اظہار ہوتا ہے۔ شاعری کی اہمیت اور ماہیت کو مسلمان فلاسفر ابن رشد، الفارابی اور ابن سینا نے بھی تسلیم کیا ہے۔ جدید دور میں مولانا شبلی نعمانی اور الطاف حسین حالی نے بھی اپنے وقت میں شاعری کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔ مولانا محمد علی جوہر کو اللہ نے شاعری کا فن بھی تفویض کیا تھا۔ شاعری جہاں ایک طرف جمالیاتی ذوق کی تسکین کا سبب ہے، وہاں قومی اور ملی جذبے کو ابھارنے کا نام بھی ہے۔ مولانا محمد علی جوہر نے شاعری کے ذریعے عوام میں قومی، ملی اور سیاسی بیداری کی روح پھونکی۔ لیکن آزادی کے لیے پہلے اپنے آپ کو پیش کرتے ہیں جس کا اظہار اس انداز سے کرتے ہیں:

پیغام ملا تھا جو حسین ابن علی کو

خوش ہوں وہی پیغام قضا میرے لیے ہے

آزادی جان کے نذرانے کے بغیر نہیں ملتی۔ آزادی کی بات ہر شخص کرتا ہے لیکن جب اپنی جان کا نذرانہ

پیش کرنے کی بات آئے تو بہت سے لوگ میدان چھوڑ کر بھاگ نکلتے ہیں۔ مولانا محمد علی جوہر عوام کو یہ پیغام دیتے ہیں کہ آزادی کے لیے ظلم و ستم کو خندہ پیشانی سے سہنا چاہیے۔ مولانا محمد علی جوہر آزادی کے لیے شہید ہونے کی لگن اور تڑپ کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

خاک جینا ہے اگر موت سے ڈرنا ہے یہی      ہوسِ زیست ہو اس درجہ تو مرنا ہے یہی  
اور کس وضع کی جو یاں ہیں عروسانِ بہشت      ہیں کفنِ سرخ شہیدوں کا سنورنا ہے یہی  
نقدِ جاں نذر کرو سوچتے کیا ہو جوہر      کام کرنے کا یہی ہے، تمہیں کرنا ہے یہی<sup>(۷)</sup>  
جب عوام نے اپنی آزادی کے لیے آواز اٹھائی تو غاصب قوت نے اس کو دبانے کے لیے ہر قسم کے ہتھکنڈے اپنائے، ظلم و ستم کا بازار گرم کیا لوگوں کو پابندِ سلاسل کیا سزائے موت کی نوید سنائی، تختہ دار پر لٹکایا گیا۔ جلیاں والا باغ کا قتل عام کو کون بھول سکتا ہے۔ لیکن مولانا محمد علی جوہر مجاہدانہ لکار میں مخاطب ہوتے ہیں:

دورِ حیات آئے گا قاتلِ قضا کے بعد

ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد

مولانا محمد علی جوہر نے اپنے جسم و جاں کی ساری توانائیاں اور صلاحیتوں کا رومِ روم ہندوستان کی آزادی کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ علم، سیاست، صحافت، مقرر، انشا پرداز اور شاعری سب کو آزادی حاصل کرنے میں صرف کیا۔ اور کہیں بھی ان میں سے کسی ایک خوبی کو اپنی ذاتی مفاد کے لیے استعمال نہیں کیا۔ مولانا محمد علی جوہر کی ان ساری خصوصیات اور خدمات کا ذکر عکس شعور میں کیا گیا ہے:

اس مردِ آئین کی سیاسی، سماجی، ادبی، تقریری اور تحریری عظمت کا لوہا سب کو ماننا پڑا، پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنے ایک خط میں لکھا ہے کہ ”میں نے سیاست محمد علی جوہر سے سیکھی۔“ گاندھی نے کہا تھا، ”حق برادران مجھے ہر وقت اپنی جیب میں سمجھیں اور جس قدر چاہیں استعمال کریں۔“ ”روحِ اقبال“ کے مصنف ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے اپنے ایک مضمون میں میرے استاد محمد علی جوہر کہہ کر انھیں یاد کیا۔ سیاست کے علاوہ بھی مولانا ایک اخلاقی ذہن و دماغ کے مالک تھے۔ غزل کی رمزیت و اشاریت و ایمائیت میں سیاسی اور قومی جذبات کے اظہار سے مولانا نے غزل کو ایک نئی جہت عطا کی، محمد علی جوہر بہت بڑے مجاہد آزادی، بے باک صحافی، بہترین شاعر اور ایک جادو بیاں مقرر تھے۔ یہ تمام

خصوصیات مولانا کی شخصیت کا جزو تھیں۔ ان سب سے عظیم اور ناقابلِ فراموش یادگار جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی ہے، جس کی بنیاد موصوف نے اکتوبر ۱۹۲۰ء میں علی گڑھ میں ڈالی۔<sup>(۸)</sup>

۱۹۳۰ء میں محمد علی جوہر بیمار تھے لیکن اس کے باوجود گول میز کانفرنس میں شرکت کی۔ اس وقت بھی مولانا محمد علی جوہر کے دل میں آزادی کی اُمگ باقی تھی۔ اس موقع پر بھی مولانا محمد علی جوہر نے بڑے ہی پُر زور اور مجاہدانہ انداز میں آزادی کا مطالبہ کیا اور اسلامی فکر اور تشخص کے احیاء کی بات کی۔ ہندوستان کو آزادی نہ ملنے پر مولانا محمد علی جوہر نے غلام ہندوستان میں آنے سے انکار کر دیا۔ مولانا محمد علی جوہر نے ۴ جنوری ۱۹۳۱ء کو یروشلم میں وفات پائی۔ آپ کی وفات پر علامہ اقبال اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

یک نفس جانِ نزار ادیبید اندر فرنگ  
تامرہ برہم زہیم، از ماہ پرویں در گزشت

مولانا ظفر علی خان ان کی وفات پر اپنے احساسات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

دکش فضا وطن کی محمد علی سے تھی  
رگینی اس چمن کی محمد علی سے تھی

محمد اور علی کے جوہر ہی کی بنا پر ہندوستان کو آزادی ملی اور مسلمانوں کو ایک الگ اسلامی ریاست پاکستان وجود میں آئی اور پاکستان کے ایک شہر کا نام جوہر آباد پڑا، ”ہم نے دشتِ امکاں کو اک نقشِ پاپایا۔“ یہ سچ ہے کہ:

ہے رشک ایک خلق کو جوہر کی موت پر  
یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

مولانا محمد علی جوہر نے سنگین حالات میں اپنی قوم کی فلاح کا بیڑا اٹھایا۔ دنیا میں ایسی شخصیات کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے جنہوں نے تاریکی اور سنگین حالات میں اپنی اقوام کی رہنمائی کی۔ تاریخ پڑھنا دنیا کا سب سے آسان کام ہے لیکن سیاسی تاریخ بنانا دنیا کا مشکل ترین کام ہوتا ہے۔ مولانا محمد علی جوہر کا شمار بھی کمال اتاترک، اور قائد اعظم جیسی شخصیات میں ہوتا ہے جنہوں نے سیاسی تاریخ بنا کر اپنی قوم کو سرخرو کیا۔

## حواشی

۱۔ مہاتما گاندھی، ”سلاش حق“، مترجم: ڈاکٹر سید عابد حسین، (دہلی: مکتبہ جامعہ، سنہ ندارد)، ص ۱۶۶

۲۔ سید رئیس احمد جعفری، ”مطابقت محمد علی“، (حیدرآباد دکن: ادارۃ اشاعتِ اردو، ۱۹۴۵ء)، ص ۱۱۳

- ۳۔ ڈاکٹر سمیع احمد، ”اردو صحافت اور تحریک آزادی“، (دہلی: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۹ء)، ص ۸
- ۴۔ سید رئیس احمد جعفری، ص ۱۳
- ۵۔ ایضاً
- ۶۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی، ”ہندوستان کی سیاسی بیداری میں مولانا محمد علی کا حصہ“، مشمولہ ”جوہر نامہ“، مرتب: حکیم محمد عرفان الحسینی، (کلکتہ: محمد علی لائبریری، ۱۹۸۷ء)، ص ۲۲
- ۷۔ مولانا محمد علی جوہر، ”کلام جوہر“، مرتب: مولانا عبد الماجد دریا بادی، (دہلی: مکتبہ جامعہ، ۱۹۳۶ء)، ص ۱۳
- ۸۔ شکیل رحمانی ودیگر (مرتبین)، ”عکس شعور (بہ یادگار مولانا محمد علی جوہر)“، (نجیب آباد: غالب اکیڈمی، ۱۹۸۵ء)، ص ۴۲

## ماخذ

- ۱۔ احمد، سمیع، ڈاکٹر، ”اردو صحافت اور تحریک آزادی“، (دہلی: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۹ء)
- ۲۔ جعفری، رئیس احمد، سید، ”مطابقت محمد علی“، حیدر آباد دکن: ادارہ اشاعت اردو، ۱۹۴۵ء
- ۳۔ جوہر، محمد علی، مولانا، ”کلام جوہر“، مرتب: مولانا عبد الماجد دریا بادی، (دہلی: مکتبہ جامعہ، ۱۹۳۶ء)
- ۴۔ رحمانی، شکیل ودیگر (مرتبین)، ”عکس شعور (بہ یادگار مولانا محمد علی جوہر)“، (نجیب آباد: غالب اکیڈمی، ۱۹۸۵ء)
- ۵۔ گاندھی، مہاتما، ”تلاش حق“، مترجم: ڈاکٹر سید عابد حسین، (دہلی: مکتبہ جامعہ، سنہ ندارد)
- ۶۔ نظامی، خلیق احمد، پروفیسر، ”ہندوستان کی سیاسی بیداری میں مولانا محمد علی کا حصہ“، مشمولہ ”جوہر نامہ“، مرتب: حکیم محمد عرفان الحسینی، (کلکتہ: محمد علی لائبریری، ۱۹۸۷ء)

